بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۝

ترجمہ: وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں (القرآن)

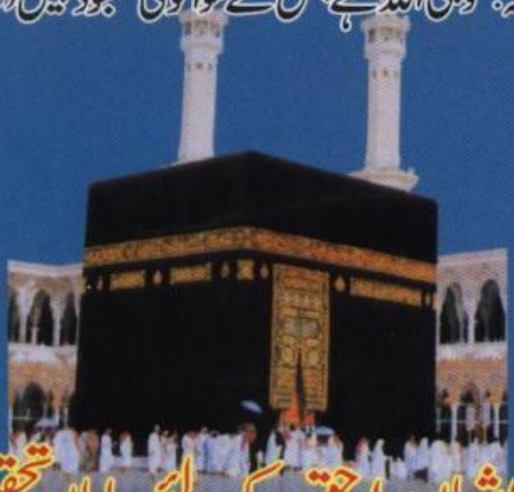

متلاشیانِ راہِ حق کے لئے سامانِ تحقیق

رسالہ مسمّٰی بہ

لفظِ اللّٰہ کی تحقیق

از رشحاتِ قلم

علّامہ پیر سیّد نصیر الدّین نصیرؔ گیلانی

سجّادہ نشین آستانہ عالیہ غوثیہ مہریہ گولڑہ شریف

لفظِ اللہ اور خُدا میں فرق

اور اِن کے استعمال پر بحث

ہمارے ہاں پاک و ہند میں اکثر پڑھا لکھا طبقہ بھی اللہ کی جگہ خُدا کے لفظ کا استعمال زیادہ کرتا ہے۔ شعر و شاعری میں ہم نے بھی خُدا کا لفظ بہت استعمال کیا، ایسا کرنا درست ہے کہ نہیں اسی سلسلے میں اپنی تحقیق پیش کرنا چاہتا ہوں۔

خُدا فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنٰی بہ اعتبارِ لغت مالک، صاحب اور سربراہ کے ہیں۔ جیسے کدخدا، دِہ خدا، ناخدا وغیرہ۔ فارسی والے اگرچہ یہ لفظ اللہ کے معنٰی میں استعمال کرتے آئے اور آج تک بھی کر رہے ہیں اور اُردو والوں نے یہی لفظ اِسی معنٰی میں اللہ تعالٰی کے اسمِ ذات کے طور پر لکھنا اور بولنا شروع کر دیا، فارسی اور اُردو کے ہزاروں شعراء کی نظم و نثر اس پر شاہد ہے۔ میں نے شاعر ہونے کے حوالے سے اپنے کلام میں یہی لفظ اللہ کے معنٰی میں خود بھی استعمال کیا ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ قرآن و سنّت اور اکابر کی تحقیق کی روشنی میں حقیقتِ حال کیا ہے۔ سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ لفظِ اللہ لُغت و اصطلاح کے اعتبار سے کن کن معانی کا حامل ہے۔ چونکہ یہ لفظ عربی زبان کا ہے، اس لیے اسکے لُغوی و اصطلاحی معانی اور پھر اُن کا محلِ استعمال ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

لفظِ اللہ خُداوندِ عالم کا اسمِ ذاتی ہے اور اُس کے اسماءِ صفات بہت ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

وللّٰہ الاسماء الحسنٰی فادعوہ بہا (القرآن 180:7)

ترجمہ: اور سب اچھے نام اللہ ہی کے ہیں۔ تو اِن (ہی) ناموں سے اُسے پکارو۔ ویسے 99 اسماء ایک ہی حدیث میں مذکور ہونے کی وجہ سے زیادہ مشہور ہیں۔ ہمارے ہاں جب کسی کا نام لیا جاتا ہے۔ تو اُس کی ہیئتِ کذائی اور ذات مع الصّفات کا تصور ذہن کی سکرین پر اُبھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ گویا صفات کو معرفتِ ذات میں گہرا دخل ہے۔

لفظِ اللہ کی اصطلاحی تعریف:

علاّمہ تفتازانیؒ لکھتے ہیں: **ھو اسم للذات الواجب الوجود المستحقِ لجمیعِ المحامد.** (ملاحظہ ہو مختصر معانی، صفحہ 5 مطبعِ علیمی لاہور) ترجمہ: وہ (اللہ) اُس ذات کے لیے اِسم ہے جو واجب الوجود ہے، تمام محامد و کمالات کا مستحق ہے۔

لفظِ اللہ کی لُغوی تعریف:

لفظِ اللہ کی تحقیق کرتے ہوئے مفسّرینِ عظام نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں۔

1. ایک قول ہے کہ یہ لفظ سُریانی ہے اصل میں لا ھا تھا، الف کو آخر سے حذف کر کے اوّل میں الف لام داخل کیا گیا اور معرّب بنایا گیا۔

2. دوسرا قول ہے کہ یہ لفظ عربی کا ہے، ذاتِ باری سے مختص ہے، کسی ماٗخذ سے مشتق نہیں اور کسی اصل پر متفرع نہیں۔ مشہور نحوی امام سیبویہ، خلیل اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمھم اللہ تعالٰی کا یہی مذہب ہے۔ کہ لفظِ اللہ غیر مشتق، جامد اور ذاتِ باری تعالٰی کا نام ہے اور اس پر بہت سے دلائل بھی دیئے جن میں سے چند ایک درجِ ذیل ہیں۔

ا۔ جس طرح اللہ تعالٰی کی ذات کسی سے پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہی کوئی اُس سے پیدا ہوا

ہے تو اُس ذات کا نام بھی ایسا ہونا چاہئے جو کسی سے متولّد و مشتق نہ ہو تا کہ اِسم اور مسمّٰی کے درمیان مناسبت رہے۔

۲۔ اگر لفظِ اللہ کو مشتق مانا جائے تو پھر یہ ایک مفہوم ِکُلی بن جائے گا، یعنی اس کا مفہوم ہو گا ''کسی کی بھی عبادت کی جائے اُسے اللہ کہتے ہیں'' یہ مفہوم شرکتِ کثیرین سے مانع نہیں تو پھر لا الہٰ الّا الله سے توحید ثابت نہیں ہوگی۔ کیونکہ مطلب یہ ہے کہ الہٰ ، اللہ کے سوا کوئی نہیں اور اللہ ہر معبود کو کہا جا سکتا ہے۔ حالانکہ بالاتفاق توحیدِ خداوندی اِسی کلمہ ءطیبہّ سے ثابت ہے۔ لہٰذا لفظِ اللہ علَم ہے مشتق نہیں۔

۳۔ ہمیشہ علَمِ ذاتی کو پہلے ذکر کیا جاتا ہے پھر اس کے دیگر اوصاف کا ذکر ہوتا ہے۔ مثلاً زید الفقیه النحوی الاصولیی بلاتشبیہ و بلاتمثیل جب کوئی اللہ کا ذکر مع اس کے اوصاف کے کرتا ہے تو پہلے لفظِ اللہ کو لایا جاتا ہے۔ پھر دیگر صفات کو جیسے اللــه، العـالم، القـادرُ ، الحكيم یوں نہیں کہا جاتا کہ العـالِم ، القادرُ ،، الله لہٰذا یہ استعمال دلالت کرتا ہے کہ لفظِ ''اللہ'' اللہ تعالیٰ کا علَمِ ذاتی ہے مشتق نہیں ہے۔

۴۔ مناطقہ ءاسلام نے لفظِ اللہ کی تعریف یوں کی ہے۔ والـلـه عَلَم على الاصحّ لـلـذات الـواجبِ الوجود المستجمع لجميع صفاتِ الكمال۔ یعنی واجب الوجود جو تمام صفاتِ کمال کا مستجمع ہے اس کا علَم ذاتی اصح مذہب کے مطابق لفظِ اللہ ہے۔ مناطقہ (منطقی علماء) کے نزدیک واجب الوجود ایک ایسی کلّی ہے۔ جس کا خارج میں تحقق محض فردِ واحد میں ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدس ہے یعنی اس کلّی میں صرف ایک ہی فرد ہے۔

3. تیسرا قول یہ ہے کہ یہ لفظ مشتق ہے اور اِس کا ماٗخذ آلَـهَ يَـالَهُ اُلُو هةَ اِلٰهَةَ اُلُوهيّةَ بمعنٰی عَبَدَ ہے۔ اسی سے تَـاَلَّـهَ ، استَاْلَهَ ہے۔ اسی صورت میں الہ بروزنِ فعال" بمعنٰی مفعول" یعنی مَاْلُوه بمعنٰی معبود ہے۔ ہمزہ کو حذف کر کے عوض میں الف لام لائے، پہلے

لام کو دوسرے میں ادغام کر کے اللہ پڑھا گیا۔

4. چوتھا قول ہے کہ اَلِـهَ فـی الشّـی ءِ اذاتَـحَیّرَ ولم یَھتَدِ سے ماٗ خوذ ہے۔ یعنی کوئی شخص جب کسی کام میں حیرت زدہ ہو اور اُسے کوئی راہ نہ ملے۔ لِاَنَّ الـعقولَ تَتَحَیَّر فی مَعرِفَته، کیوں عقلِ انسانی معرفتِ الٰہی میں حیران رہ جاتی ہے۔

5. پانچویں قول کے مطابق یہ لفظ وَلِـهَ یَـولَهُ اذاتَحیّرُو تَخبّطَ عقلُه' سے ماٗ خوذ ہے اِس صورت میں الٰہ اصل میں وِلاہ ہوگا، واؤ کو ہمزہ سے تبدیل کیا گیا۔

چنانچہ امام راغب اصفہانیؒ مفردات القرآن میں فرماتے ہیں وقیـل اصـلهٗ وِ لاہ فأ بدل مـن الـواو هـمزة و تسـمیتـهٗ بـذٰلك لـكـون كـل مـخـلـوقٍ والِهـاَ نحوهٗ أمّـا بـالتسـخیـرِ فـقـط كـا لـجـماداتِ والـحیواناتِ و اُما بالتسخیر والا را دَةِ مـعـاًكبـعـضِ الـنّـاس و مـن هـذا الوجه قالَ بعض الحكماء : الـلـه محبوبُ الاشیـاء كـلِّهـا دلّ قـولـه تـعـالىٰ (واٗن من شئٍ الا یسبحُ بحمدهٖ و لٰكن لا تـفقهونَ تسبیحهم) یعنی ایک قول یہ بھی ہے کہ اله کا اصل وِلاہ تھا پس واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا اور اُس ذاتِ باری کا نام ہوا کیونکہ ساری مخلوق اُسی کی طرف شیدا و مشتاق ہے یا تو تسخیر کے اعتبار سے جیسے کہ جمادات (پتھر وغیرہ) اور حیوانات یا تسخیر اور ارادہ دونوں کے اعتبار سے جیسے کہ مطیع انسان۔ اسی وجہ سے حکماء نے فرمایا اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کا محبوبِ (حقیقی) ہے، جس پر یہ ارشادِ قرآن دلالت کرتا ہے۔ وَاِن من شی ءٍ الّا یسبّح بحمدهٖ۔

6. چھٹے قول کے مطابق یہ لفظ اَلِهـتُ الىٰ فـلانٍ سَـكَنتُ الیـهِ سے ماٗ خوذ ہے اور وجہِ مناسبت یہ ہوگی لانّ الـقُـلُوبَ تَطمَئنُ بِذكرهٖ والَا رواحَ تَسكُنُ الیهِ یعنی دلوں کو اس کے ذکر سے اطمینان اور رُوحوں کو اُس سے سکون حاصل ہوتا ہے۔

7. ساتویں قول کے مطابق آلَـهَ اذا فَـزَعَ مـن اَمـرٍ نَزَلَ علیهِ سے ماٗ خوذ ہے اور اِسی

سے ہے اَلَهَہٗ غَیرُہٗ اَجَارَہٗ اذا العائذُ یَفزَعُ الیهِ و هُو یُجِیرُہٗ حقیقةً او بِزَعمِهٖ یعنی اُس کے غیر نے اُسے پناہ دی، چونکہ پناہ مانگنے والا اُس کی طرف پناہ لینے کے لیے بڑھتا ہے اور وہ اُسے حقیقتاً پناہ دیتا ہے، یا اُس کے خیال کے مطابق الهه٘ میں ہمزہَ بابِ افعال سلبِ ماٴخذ کے لیے ہے۔

8. آٹھواں قول ہے کہ یہ لفظ اَلَهَ الفَصِیلُ اذا ولِعَ بِاُمِّهٖ سے ماٴخوذ ہے، یعنی اُونٹنی کا بچہّ ماں کی طرف لپکا۔ اذا العبادُ مُولِعُونَ بِالتّضرّعِ الیهِ فی الشّدائدِ ، کیوں کہ مصائب و آلام میں بندے عاجزی سے اُس کی طرف مُلتجی ہوتے ہیں۔

9. نواں قول ہے کہ یہ لفظ لَاہَ یَلِیۡهُ لَیهَا و لا هَا اِذَا حُتَجَبَ وَارتَفَعَ سے ماٴخوذ ہے۔ لانّہٗ تعالیٰ مُحتَجِبٌ عن ادراکِ الابصارِ و مُرتَفِعٌ عمّا لا یَلیقُ بهٖ۔

ترجمہ: کیونکہ اللہ تعالٰی ابصار کے ادراک سے حجابِ انوار میں ہے اور ہر اُس شے سے بلند و بالا ہے، جو اُس کی شان کے لائق نہیں (تفصیل مزید کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی صفحہ 4، مطبوعہ میر محمد کتب خانہ آرام باغ کراچی) ایضاً تفسیر کبیر از امام رازیؒ، جلد اوّل صفحہ 83، مطبوعہ بیروت 1978ء)

لفظِ اللہ سے بحث اِس لئے کی گئی تا کہ اِسکا صحیح مفہوم ذہن نشین ہو سکے، جیسا کہ پہلے مسطور ہوا کہ اللہ اسمِ ذات ہے، اسماءِ صفات بہت ہیں اور یہ کہ صفات کی معرفت کے بعد معرفتِ ذات حاصل ہوتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ جب آپ کسی کے لیے مطلقاً کہہ دیں کہ وہ انسان ہے تو مخاطب کو صرف اتنا معلوم ہوگا کہ وہ انسان ہے، اُس کا کماحقہٗ عرفان اُس وقت ہوگا، جب آپ اُس کی صفات کا ذکر کریں گے۔ اگر تنہا لفظِ اللہ ذاتِ باری کی جملہ صفات کو محیط ہوتا تو اللہ تعالٰی اپنے اسماءِ صفات کا قرآنِ مجید میں جا بجا ذکر نہ فرماتا۔ مثلاً ارشاد ہوا :

هوالله الذی لا الٰه الّا هُو ، الملك القدّوس السّلام المؤمن المهیمن

العزیز الجبّار المتکبر ۔ ترجمہ: وہی ہے اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں بادشاہ ہے پاک ذات، ہر نقص سے سالم امان بخشنے والا، نگہبان، بہت غالب، نہایت عظمت والا، کبریائی والا، جب ہم آیۂ محولہ بالا میں مذکورہ اور اِن کے علاوہ تمام دیگر صفاتی اسماء کو ذہن میں لاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان اسماء کا مسمّٰی اور مرجع اللہ ہے۔ مگر اِس کے باوجود اُس کی کُنہ اور حقیقت کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ یہاں پہنچ کر مجھے اپنے والدِ گرامی حضرت پیر سیّد غلام معین الدین مشتاقؔ علیہ الرّحمہٗ کے دو شعر بے ساختہ یاد آ گئے، جو اسی حقیقت کو واضح کر رہے ہیں فرماتے ہیں۔

نمود اپنا جب کنزِ مخفی نے چاہا اَحببتُ اَنْ اُعرَفَ کہہ سنایا
تو وحدت نے کثرت میں جلوہ دکھایا مگر ذات مخفی کی مخفی رہی ہے
ہوئی ذات جلووں کی مشتاقؔ جس دَم تو بحرِ ہُویّت میں آیا تلاطم
بنی گرچہ خود ہی وُجودِ دو عالم حقیقت مگر پھر حقیقت رہی ہے

اس لئے کہ اُس کی ذات بے کراں و لامحدود اور انسانی ادراک و شعور انتہائی محدود ہے، معلوم ہوا کہ لفظِ اللہ تمام صفات و کمالات کی جامع ذات پر دلالت کرتا ہے، اس لئے باقی صفات کی نسبت اُسے (لفظِ اللہ کو) اسمِ ذات کہا جائے گا، گویا لفظِ اللہ اسماءِ صفات کی مناسبت سے اسمِ ذات ہے اور ایسا اسم کہ جو ذاتِ بحت اور حقیقتِ مطلقہ کی نشاندہی کے لیے قریب تر لفظ ہے، مگر سچ تو یہ ہے کہ کوئی لفظ بھی درجۂ اطلاق اور ھُویّتِ محضہ کی مکمل ترجمانی نہیں کر سکتا۔ بقول مولٰینا نظیری نیشاپوری ؒ ؎

کُنہِ ذاتِ تو بہ ادراک نشاید دانست
ویں سخن نیز بہ اندازۂ ادراکِ من است

یعنی تیری ذات اور تیری حقیقتِ حقّہ کا ادراک بے چارے حواسِ خمسہ کے بس کی بات نہیں اور یہ اعترافِ عجز بھی تو میرے ظرفِ ادراک ہی کے مطابق ہے جب کہ تُو لفظی اعتبارات

کی گرفت سے بالکل آزاد اور وڑی ہے اور ہمارے خیال، قیاس و گمان اور وہم کی سرحدوں سے بہت دُور ہے۔ بقولِ عارفِ رومیؒ۔

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من
خاک بر فرقِ من و تمثیلِ من

یا بقولِ اکبرالٰہ آبادیؒ۔

ذہن میں جو گھِر گیا لا انتہا کیوں کر ہوا
جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خُدا کیوں کر ہوا

تعیّناتِ ذات:

کسی منطقی نتیجہ پر پہنچنے سے قبل تصوف اور صوفیاء کے حوالے سے لفظِ اللہ پر کچھ دیر اور بحث کر لی جائے۔ یہ درست ہے کہ لفظِ ''اللہ'' ذات کے ایک مرتبہ و مقام کی تعیین ضرور کرتا ہے مگر اُس کی حقیقت و اصلیت کی نہیں۔ صوفیائے ذی علم کے نزدیک وُجود کے چھ (6) مراتب ہیں جنہیں اصطلاح میں مراتبِ ستّۂ وجود کہا جاتا ہے۔ جب ذاتِ بحت اور حقیقتِ مطلقہ نزول کرتی ہے تو اُسے اَحَـدْ کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ وہ ایک ہے اور جب حقیقتِ مطلقہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہاں اُس پر اَحَد کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اس کے معنٰی یہ ہوئے کہ ہم اللہ کو ایک ہونے میں مقیّد کر رہے ہیں، جب کہ وہ ہر قسم کی قید سے آزاد اور حقیقتِ مطلقہ ہے۔ بقولِ حضرت بیدلؒ۔

مشو مُحاسبِ غفلت بہ علمِ یکتائی   اَحَد شمردنت اینجا حسابِ معدود است

صوفیائے کرام اِس مقام کو ھُـــوْ سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ ایک ایسا مقام ہے کہ جہاں بقولِ مستان شاہ کابلیؒ۔

نہ موسیٰ گفتن و آنجا نہ فرعون   چہ جائے کفر، ایماں ہم نہ گنجد

یا پھر اِس مقام کی نشاندہی مولٰینا جامیؒ کا درجِ ذیل قطعہ کرتا ہے۔

نہ بشر خوانمت اے دوست! نہ حور و نہ پری
ایں همہ بر تُو حجابست تُو چیزے دگری
ہیچ چیزے نتواند کہ کند بند ترُا
در صُوَرِ ظاہری ، امّا نہ اسیرِ صُوَری

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، ھُویّتِ محضہ کے اعتبار سے لفظِ اللہ بھی صفاتی نام معلوم ہونے لگتا ہے۔ جیسے زید ایک مخصوص شخص کا علم ہونے کے باوجود اُس کی حقیقت کے پیشِ نظر ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ بہرحال ھُوَ کا مصداق جو کہ حقیقتِ ذات ہے، اُس کا کوئی نام نہیں، مذکورہ بالا تصریح سے معلوم ہوا کہ کائنات میں صفات کا ظہور ہے، یہاں تک کہ ذاتِ باری کی حقیقت کا کوئی نام نہیں۔ اِس سلسلے میں مرزا عبدالقادر بیدلؒ کا یہ شعر کس قدر برمحل اور خوبصورت ہے۔

جُہدِ تعطیلِ صفت نفیِ کمالِ ذاتست
یا بگو یا بشنو ، گفت و شنیدست اینجا

جب ذہن اُس کی ذات کی طرف احرامِ سفر باندھ کر اِنّی ذاھب" الیٰ ربّی کہتا ہے۔ تو وہ اِسم جو اُسے اُس کی ذاتِ حقیقی کے زیادہ قریب لا سکتا ہے، وہ لفظِ اللہ ہی ہے۔ مگر حقیقت پھر بھی مخفی کی مخفی ہی رہتی ہے اور اُس مخفی حقیقت کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ ثابت ہوا کہ جب اِس کائنات کے خالق و مالک کی حقیقی ذات کا نام نہیں تو دنیا میں اور کس کی ذات ہے، جس پر کسی لفظ کا بحیثیتِ ذات اطلاق ہو سکے۔ یہ کائنات ایک حیرت کدہ ہے، اس میں ہر نام صرف ایک علامت ہے اور ہر شے کا اِسم، اِسمِ صفاتی ہے ذاتی نہیں، جو بطورِ نسب حقیقی معانی میں استعمال کیا جا سکے، گویا اس عالمِ ماکانَ و مایکون میں ایک ایسی ذاتِ حقیقی ضرور جلوہ فرما ہے، جسکی

جلوہ گاہ تمام کائنات ہے۔ بقول حضرتِ مرزا عبدالقادر بیدلؒ۔

تمام شوقیم لیک غافل کہ دل براہِ کہ می خرامد
جگر بداغِ کہ می نشیند ، نَفَس بہ آہِ کہ می خرامد
غبارِ ہر ذرّہ می فروشد بہ حیرت آئینۂ تپیدن
رمِ غزالانِ ایں بیاباں پئے نگاہِ کہ می خرامد
زرنگِ گُل تا بہارِ سُنبل شکست دارد دماغِ نازے
دریں گلستاں ندانم امروز کج کلاہِ کہ می خرامد
نگہ بہرجا رسد چو شبنم ز شرم می باید آب گردد
اگر بداند کہ بے محابا بجلوہ گاہِ کہ می خرامد
مگر ز چشمش غلط نگاہے رسد بفریادِ حالِ بیدلؔ
وگرنہ آں برقِ بے نیازی پئے گیاہِ کہ می خرامد

اُس ذاتِ مطلقہ کی عادت یہ ہے کہ اُس نے اپنی ذات کو تمام تر توضیحات وتشریحات کے باوصف مخفی رکھا اور اپنی حقیقی ذات کا نام نہیں بتایا، بلکہ اسماءِ صفات کے ذریعہ سے اپنی پہچان کرائی، اس لئے ساری کائنات بھی کسی حقیقی یا ذاتی نام سے موسوم نہیں ہو سکتی، اعتباری، علامتی اور صفاتی نام سے ہی پکاری جائے گی۔ کیوں کہ اُس کی ذات کے سامنے اور کون ہے، جو اپنی ذات کو ثابت کر سکے۔ ذات تو ایک ہی ہے، جس طرح واجب الوجود کے مقابلہ میں ساری کائنات ممکن الوجود ہے، اِسی طرح اُس کی ذاتِ حقیقی کے سامنے تمام موجودات محض اعتباری اور عارضی اشیاء ہیں اور اعتباری و عارضی شے کی ذات ہی جب عارضی و اعتباری ہوتی ہے تو اُسکے نام ذاتی اور حقیقی کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ خیر یہ بحث علم الکلام سے متعلق ہے، اب ہم شاعری میں لفظِ خُدا کے متعلق کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ اسی مقالہ کی ابتداء میں ذکر ہوا کہ لفظِ

خُدا چوں کہ فارسی زبان کا لفظ ہے اور یہ بہت سے معانی کے لیے بولا جاتا ہے۔ فارسی والے یہ لفظ چوں کہ اللہ کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا خدا کے لفظ میں اللہ کے معنٰی پائے بھی جاتے ہیں کہ نہیں۔ فارسی کی مشہور لُغت دِہ خُدا میں اُس کے معانی درج ذیل ہیں۔

خُدا نامِ ذاتِ باریِ تعالیٰ است ہمچو "الہ" و "اللہ" یعنی خُدا فارسی زبان میں ذاتِ باری تعالیٰ کا نام ہے۔ جیسے کہ عربی میں الـہٗ یا اللـہ ہے۔۔۔ خُدا در زبان فارسی بمعنیٰ اللہ گرفتہ شدہ (از حاشیہ دکتر معین بر برھانِ قاطع)۔۔۔ و چوں لفظ مطلق باشد بر غیرِ ذاتِ باری تعالیٰ اطلاق نکنند مگر در صورتے کہ بچیزے مضاف شود چوں کہ خداوہ خدا گفتہ اند کہ خدا بمعنی خود آیندہ است چہ مرکبؒ است از کلمۂ "خود" و کلمۂ "آ" کہ صیغۂ امر است از آمدن و ظاہر است کہ امر بہ ترکیب اسمِ معنٰی اسمِ فاعل پیدا می کند و چوں حق تعالیٰ بظہورِ خود بدیگری محتاج نیست، لہٰذا بایں صفت خوانند (از غیاث اللّغات) پارسیان اطلاق ایں لفظ تنہا بر خداوند تعالیٰ کنند۔۔ بہ ہندی خدارا "رام" می گویند و در قاموس کتاب مقدس آمدہ است، خدا یعنی از خود بوجود آمدہ و آں اسمِ خالقِ جمیع موجودات و حاکمِ کل کائنات می باشد۔۔ الخ ان تمام حوالہ جات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فارسی زبان والے لفظِ خدا کو اسی معنٰی میں استعمال کرتے ہیں، جس معنٰی میں عربی میں لفظِ اللہ کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن لفظِ اللہ چوں کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا ذاتی علم ہے لہٰذا کسی بھی حال میں اُس کا استعمال ذاتِ باری کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتا، جبکہ لفظِ خُدا اضافت کے ساتھ غیروں کے لئے بھی استعمال ہوسکتا ہے۔

مثلاً: شہر خُدا ، رئیسِ شہر، بزرگِ شہر

کد خُدا ، رئیسِ دہ ، دہ خُدا

کد خُدا، رئیسِ دہ، دہخدا، درج ذیل اشعار میں ان مقولہ بالا مثالوں کا مفہوم ذہن نشین کر لیں

اگر گنجی کنی برعامیاں بخش
رسد ہر کد خدائے را برنجی
سرکہ از دسترنج خویش و ترہ
بہتر از فان کد خدا و برہ

(گلستانِ سعدی)

یا ناوٗخُدا، فرماں دہِ ناؤ، رئیس کشتی، فرماں دہِ کشتی، جیسا کہ درجِ ذیل شعر ہے۔

برو کشتی آنجا کہ خواہد خُدا
اگر جامہ برتن درد ناخُدا

یعنی ناخُدا اصل میں ناوٗخدا ہے کہ ناوٗ (کشتی) کوحکم دینے والا۔ اُس پر اختیار و تصرف رکھنے والا۔ نتیجہ وخلاصہ اِس ساری بحث کا یہ ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ جوصفات وکمالات میں بے مثل، بے ہمتا اور غیر فانی وغیر محدود ہے اگر چہ اُس ذات کے کمالات وصفات کو من حیث ھو ھو تو لفظِ اللہ بھی بیان نہیں کرسکتا مگر پھر بھی لفظِ خُدا کی نسبت لفظ اللہ میں معنوی وسعت کہیں زیادہ ہے۔ لفظِ اللہ چوں کہ اپنے اندر معنوی وُسعت و جامعیت رکھنے کے علاوہ عربی زبان سے بھی تعلق رکھتا ہے اور احادیثِ طیبہ میں عربی زبان کی فضیلت وعزّت متعدد مقامات پر بیان ہوئی ہے۔ نیز جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے اسماءِ صفاتی میں سے کسی اسمِ مبارک کو اپنی زبان سے ادا کرتا ہے تو وہ صرف اُسی ایک صفت کا ذکر کرتا ہے۔ جیسے کہ ''خُدا'' کی پوری توضیح کتبِ لُغت کے حوالے سے ابھی گزری ہے۔ تو لفظِ خُدا کہنے سے بھی صِرف اُس ذات کی یہی ایک صفت بیان ہوگی کہ ''خود بخود موجود ہونا'' حالانکہ جب لفظِ اللہ کو زبان سے ادا کرتا ہے تو اُس کے ضمن میں تمام صفات کا بیان بھی ہوجاتا ہے۔ اور پھر جس طرح کلمہٗ اللہ کا ہر ہر حرف بامعنیٰ ہے اور اگر اِس کلمہ کا ایک ایک حرف کم کرنا شروع کردیں تب بھی اس کی معنویت میں کوئی

کمی نہیں آئے گی۔

لفظِ اللہ کے خواص:

لفظِ اللہ جب اسی طرح پور لفظ ہو تب تو مکمل معنٰی پر دلالت کرتا ہی ہے کہ اِسی سے ذاتِ باری تعالٰی، معبودِ برحق کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن اگر اس میں سے کچھ حروف حذف بھی کر دیے جائیں تب بھی اس کی دلالت اُسی طرح باقی رہتی ہے۔ مثلاً لفظِ اللہ سے پہلے ہمزہ کو حذف کر دیا جائے تو باقی لفظ للہ بچتا ہے۔ یعنی اللہ کیلئے قرآن پاک میں ہے و للّٰہِ جنود السمٰوٰتِ وَالارض٥ وللہ خزآئن السمواتِ وَالارض ٥ اور جب پہلی لام کو حذف کر دیں تو باقی رہے گا لہٗ ۔ پھر بھی دلالت باقی ہے کہ لہٗ مقالید السمٰوٰتِ والارض٥ لہٗ المُلك وَلَہٗ الحمد اور اگر دوسری لام کو حذف کر دیا جائے تو باقی رہے گا ہٗ واوٗ زائدہ ساتھ لگائیں تو بنتا ہے ھُو۔ معنٰی ہے وُہ ذات یعنی ھُوَ اللہ احد" ھوالحیّی القیوم۔ یہ لفظ اللہ کا خاصہ ہے۔ تو ایسا اسم اور کوئی نہیں ہے جو اس قدر ہمہ جہت اور ہمہ پہلو جامع ہو۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ بجائے لفظِ خدا کے ہمیشہ لفظِ اللہ ہی کا تکلم کریں۔ اور اپنی گفتگو میں لفظِ اللہ ہی کا استعمال کریں۔ خصوصاً وقتِ الوداع ہم کہتے ہیں۔ ''خُدا حافظ'' یہاں بھی ''اللہ حافظ'' ہونا چاہیے۔ پہلے پاکستان ٹیلی ویژن کے مختلف پروگراموں میں کمپیئر حضرات یا نیوز کاسٹر جاتے ہوئے ''خُدا حافظ'' کہتے تھے۔ ایک دو بار پی ٹی وی کے بااختیار نمائندوں سے بات چیت ہوئی تو اُن کی توجہ مَیں نے اِس جانب دلائی۔ بحمد اللہ تعالٰی اس کے بعد آج تک اللہ حافظ ہی کہا جا رہا ہے۔ ویسے عربی گرائمر کے قانون کے مطابق بھی اللہ حافظ بہتر ہے کیونکہ یہ مُبتدا و خبر ہے اور مبتدا و خبر کا ایک زبان سے ہونا ضروری ہے۔ جب کہ لفظِ خُدا فارسی کا ہے اور لفظِ حافظ عربی ہے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ اللہ حافظ کہا جائے تا کہ یہ دعائیہ جملہ عربی ہونے کی وجہ سے آسرَع

فی الاجابة کا حامل ہو جائے۔ یعنی جلدی قبول ہو۔ اور اس کا ایک ایک حرف دس دس نیکیاں بھی دلائے۔ کیوں کہ حدیثِ شریف کے مطابق عربی زبان میں مانگی گئی دعا جلدی قبول ہوتی ہے۔ اور اللہ حافظ دونوں قرآنی کلمے ہیں اور قرآن شریف کے ایک حرف کے بدلے دس نیکیاں ملتی ہیں اور دس گناہ بھی معاف ہوتے ہیں۔

جیسا کہ ابتداء میں ذکر کیا گیا کہ فارسی و اُردو کے نثر نگاروں نے بالعموم اور شاعروں نے بالخصوص لفظِ خُدا بمعنیٰ اللہ بہت استعمال کیا اور آج تک کر رہے ہیں۔ اِس میں صوفیائے کبار علمائے عظام اور شعراء و ادباءِ سلف سب شامل ہیں۔ حتّٰی کہ متاخرین میں مولنا احمد رضا خان صاحب فاضلِ بریلوی رحمتہ اللہ علیہ نے اگرچہ لفظِ خُدا کے استعمال کی ممانعت فرمائی اور اللہ کے لفظ کے استعمال پر زور دیا، مگر اُن کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اِس کی پابندی نہ کر سکے، اور خدا بمعنیٰ اللہ متعدّد اشعار میں باندھا ہے۔ فاضل بریلوی ؒ کے علاوہ اُن کے بہت سے ایسے معاصرین کے کلام میں یہی بات ملتی ہے، جو علم و فضل اور اتباعِ قرآن و سنت میں یگانۂ روزگار تھے۔ یہاں اعتراض وارد ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ جانتے ہوئے ایسے فاضلِ روزگار حضرات نے اپنے کہے کے خلاف عمل کیوں کیا؟

مخالفین محض عناد کی وجہ سے تو پھر بھی بہت کچھ کہیں گے اور کہتے رہیں گے۔ مگر علم و ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناتے جو بات میری سمجھ میں آئی ہے وہ ضرور پیش کروں گا۔ یہ درست ہے کہ ہم نے لفظِ اللہ پر لُغوی اصطلاحی اور شعری حیثیت سے بہت ہی وقیع بحث کر لی۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ہم جس ملک اور تہذیب میں سانس لے رہے ہیں، وہ کیا اور کیسی ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ تقریباً آٹھ سو سال پاک و ہند میں فارسی زبان رائج رہی اس لئے اردو میں اب بھی اکثر و بیشتر الفاظ فارسی کے استعمال کئے جاتے ہیں، اردو کو اگر عربی اور فارسی الفاظ سے الگ کر دیا جائے تو اِس کا دامن اس قدر تنگ ہو جائے گا کہ متکلم کے لئے ابلاغِ مفہوم میں مشکلات

واقع ہونے لگیں گی۔ یہی حال فارسی کا ہے کہ اگر اُس سے عربی زبان کے الفاظ نکال دیئے جائیں تو انسانی گفتگو کا دائرہ نہایت ہی تنگ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اردو، عربی اور پھر فارسی کی ایک معجونِ مرکب زبان قرار پاتی ہے۔ پھر شاعری میں بالخصوص قافیہ وردیف کا التزام ایک بہت اہم مسئلہ ہوتا ہے، جسے صرف شاعر ہی سمجھ سکتا ہے۔ شعر میں بعض اوقات اللہ کا لفظ نہیں بیٹھ سکتا، مثلاً کسی غزل، نعت یا حمد کا قافیہ دُعا، التجا، ثنا وغیرہ ہو تو اس میں خدا ہی بطورِ قافیہ آ سکتا ہے۔ اللہ نہیں آ سکتا۔ ہاں اگر اکراہ، جانکا، تباہ، راہ وغیرہ قافیہ ہو تو پھر اللہ کا لفظ بطورِ قافیہ آ سکتا ہے۔ یہاں خدا کا لفظ لانا فنِ عروض کے خلاف ہوگا۔ پھر شعر میں صوتی آہنگ کو بھی دیکھنا پڑتا ہے تاکہ تسلسل برقرار رہے اور سامع کی سماعت مسلسل محظوظ ہوتی چلی جائے۔ کلام میں قافیہ ایک خاص لطف دیتا ہے، غیر مسجع عبارات کی نسبت، مسجع اور مقفّٰی نثر کا تسلسل، لطف اور سماعتی تلذذ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اِن فنی اور لسانی محاسن کا عظیم ترین شاہکار قرآنِ مجید ہے، جسے پڑھ، سُن کر فصحاء و بلغاء نے بات کرنے کا ڈھنگ سیکھا، عرب جیسے نک چڑھے فصیح و بلیغ جس کلام کی فصاحت و بلاغت اسلوبِ بیان، الفاظ کے صوتی آہنگ اور معانی کی رفعتیں دیکھ کر سر بسجدہ ہو گئے۔ اگرچہ روایتی شاعری اور قرآنِ مجید میں مماثلت پیدا کرنا اور اُسے انسانی غور و فکر کے نتیجے کی طرح سمجھنا ایک بہت بڑی گستاخی بلکہ کفر کے مترادف ہے۔ لیکن صرف بات سمجھانے کی حد تک قارئین کی توجہ بعض قرآنی آیات کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا، کیوں کہ ہمارے ہاں علمِ معانی میں قرآن کو نظم کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ یہ بات نظمِ قرآنی سے یوں سمجھی جاتی ہے۔ ہماری درسی کتابوں میں مختصر المعانی وہ کتاب ہے، جس کے پڑھنے سے انسان پر قرآنِ مجید کی فصاحت و بلاغت کے مقامات اور الفاظ و معانی کے باہمی رشتوں کے درجات کا دروازہ کھلتا ہے۔ علمِ بلاغت (معانی و بیان) والے کلماتِ قرآنیہ کو لفظِ نظمِ قرآن سے تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ مختصر المعانی کے خطبہ ہی میں علامہ سعد الدّین تفتازانیؒ لکھتے

ہیں: و نظم القرآنِ تالیف کلماته مترتبة المعانی متناسقة الدّلالات علیٰ حسب مایقتضیهِ العقل لا توالیها فی النطق وضمّ بعضها الیٰ بعضٍ کیف ما اتفق ترجمہ: نظمِ قرآن ان کلمات کی تالیف کو کہتے ہیں۔ جو معنوں پر باترتیب دال ہوں اور دلالتوں میں اس طرح متماثل ہوں کہ عقل کے تقاضوں پر پورے اتریں نہ یہ کہ پے در پے کلمات کو نطق میں ایک دوسرے کے ساتھ کیف ما اتفق جمع کر دیں۔ یعنی صرف ایک کلمے کو دوسرے کلمے کے ساتھ ملا کر کلام کو جوڑ دینا کہ بہ اعتبارِ معانی اُن میں ترتیب ہو یا نہ ہو اور دلالتوں میں تناسق ہو یا نہ ہو اس کو نظمِ قرآن نہیں کہتے، بلکہ نظمِ قرآن کلمات کی اُس تالیف کو کہتے ہیں جس میں ان اُمور کی رعایت ہو جن کا بلغاء (اہلِ بلاغت) اپنے کلام میں لحاظ کرتے ہیں۔ جیسے تاکید، تقدیم، حذف اور اضمار وغیرہ یعنی جہاں تقدیم کی ضرورت ہو وہاں تقدیم لائیں، جہاں تاکید کی ضرورت ہو وہاں تاکید لائی جائے۔ اور دلالتیں اُس تالیف میں ایسی اور بایں طور لائی جائیں کہ حال کے مقتضٰی کے مطابق ہوں۔ مفہوم و ماحول جیسی دلالت کا تقاضا کرتا ہے اُسی کے مطابق دلالت بھی ہو۔ دلالت مطابقی، تضمّنی یا التزامی جس کا تقاضا حال کرے ویسی ہی ہو اور ترتیب و تناسق ایسا ہو جس کی عقل مقتضِی بھی ہو فقط الفاظ و کلمات کو جمع نہ کر دیا گیا ہو۔ تو قرآن جو ایک آفاقی و دائمی معجزہ ہے۔ اِس کا اعجازِ کمال اِسی کمالِ بلاغت کی وجہ سے ہے اور کمالِ بلاغت اِسی نظم کے اعتبار سے ہے۔ یہاں ضمناً ایک اہم مسئلہ کی طرف بھی اہلِ علم و دانش قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ وہ یہ ہے کہ قرآنِ پاک کے اعجاز پر ہر دور کے علماء کا اتفاق رہا اور ہے۔ البتہ سببِ اعجاز میں اختلاف ہے، لہٰذا اس بارے میں علمائے کرام کے متعدد اقوال ہیں جن میں

پہلا قول: یہ ہے کہ قرآنِ مجید کا اعجاز اس کا غیب کی خبروں پر مشتمل ہونے کے سبب

ہے، جیسا کہ خود کلامِ مجید میں ہے تِـلك مِـن أنباءِ الغیبِ نو حیھا اِلیكَ یعنی یہ وہ غیب کی خبریں ہیں جو اے نبی! ہم آپ کی طرف بھیجتے ہیں۔ باوجود حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُمّی ہونے کے، کہ نہ آپ نظمِ کتاب سے واقف تھے، نہ عقدِ حساب جانتے تھے، نہ آپ عالمِ سحر تھے، نہ آپ نے کہانت سیکھی تھی، نہ تاریخ وجغرافیہ یا خطابت وشعر گوئی کا تجربہ رکھتے تھے۔ پھر ایسی مصدوق ومصدق پکی خبریں جو صدیوں بعد بھی سچ ثابت ہو رہی ہیں، آپ تک بذریعۂ وحی پہنچیں، یہی خبریں قرآنِ مجید میں موجود ہیں اسی سبب سے قرآن کا اعجاز ہے۔

دوسرا قول: علماء کا یہ ہے کہ قرآنِ پاک کا نظم ونثر، خطب وشعر، رجز وسجع ایسے تمام تکلفات سے پاک ہونے کے باوجود جاذبِ قلوب ہونا کہ دلوں کو کھینچ لیتا ہے اور دلوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ یہی اس کے اعجاز کا سبب ہے۔

تیسرا قول: ہے کہ قرآنِ پاک کا ہر قسمی اختلاف وتناقض اور تضاد سے پاک ہونا سببِ اعجاز ہے جیسا کہ اللہ نے خود ارشاد فرمایا افلا یتدبرون القرآن ولوکان من عندِ غیر اللہ لَوَجَدُ وافیہِ اختلافاً کثیرا۔ ترجمہ: کیا یہ لوگ قرآنِ مجید میں غور وفکر نہیں کرتے کہ اگر قرآن اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کا کلام ہوتا تو اس میں کثرت سے اختلاف پایا جاتا۔

چوتھا قول: یہ ہے کہ قرآنِ پاک کا کلامِ الٰہی کے ساتھ قدیم ہونا اِس کا سببِ اعجاز ہے۔

پانچواں قول: یہ ہے کہ سببِ اعجازِ قرآن فصاحتِ الفاظ وبلاغتِ معانی ہے اور یہی آخری قول زیادہ صحیح اور اکثر علماء کا مختار ہے بلکہ اگر دقیق نظر سے اس سبب کے مفہوم پر غور کیا جائے تو دیگر تمام اقوال بھی اسی قول کے اندر جمع ہو رہے ہیں۔

بہرِ حال صاحبِ مختصر المعانی کے نزدیک قول مختار وراجح ہے کہ سببِ اعجازِ قرآن فصاحتِ لفظی و بلاغتِ معنوی ہے، کیونکہ عرب کو اصحابِ فصاحت وار بابِ بلاغت اور رؤسائے بیان و مقتدر علی اللّسان ہونے کے باوجود جس چیز نے قرآنِ پاک کے معارضے سے عاجز و حیران کر دیا وہ اس کی فصاحت و بلاغت اور اس کا ایجاز ہے۔ چنانچہ جس وقت ایک اعرابی نے آیت فاصدع بِمَا تؤمرُ وَأعرِض عن الجاهلين سنی تو فوراً سر بسجدہ ہو گیا اور پکار اُٹھا کہ مجھے اس کلام کی فصاحت نے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کر دیا۔ امامِ اصمعیؒ نے جب ایک عربی کنیز سے فصیح کلام (اشعار) سُن کر اظہارِ تعجب کیا تو اس نے جواب دیا کہ کیا قرآنِ پاک کی آیت ”واوحينا الىٰ أُمّ موسىٰ ان ارضعيه “ کے بعد بھی اس قسم کے کلامِ مخلوق کی فصاحت پر تعجب کیا جا سکتا ہے؟ جب اس کی ایک مختصر سی آیت میں کمالِ بلاغت موجود ہے۔ جس میں دو امر (ارضعيه ، القيهِ) دو نہی (لا تحافى ، ولا تحزنى) دو خبریں (اوحينا ، فاذاخفتِ) دو بشارتیں (انّار آدوهُ اور جاعلوه من المرسلين) جمع ہیں۔

قرآنِ مجید کے اسی سببِ اعجاز کی طرف اشارہ علاّمہ تفتازانیؒ یوں فرماتے ہیں۔

بهٖ يعرف ان القرآن معجز لكونه فى اعلىٰ مراتب البلاغة لاشتمالهٖ على الدّقائق والاسرار الخارجة عن طوق البشر و هذا وسيلة الىٰ تصديق النبى عليه السلام و هو وسيلة الى الفوز بجميع السعادات۔ یعنی اس علمِ بلاغت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن عاجز کرنیوالا ہے کیونکہ وہ اعلیٰ مراتبِ بلاغت پر ہے اور وہ ایسے باریک نِکات اور رموز پر مشتمل ہے جو انسانی قدرت سے باہر ہیں اور یہ معرفتِ اعجازِ قرآن نبی کریم ﷺ کی تصدیق کا وسیلہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق تمام دُنیوی اُخروی سعادتوں اور نیک بختیوں کا وسیلہ ہے۔

نظمِ قرآن اور اُس کی فصاحت و بلاغت کے مختصر بیان کے بعد اب نظمِ قرآن ہی سے یہاں

ایک دومثالیں دے کر بات سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اذا زلزلت الارض زلزالهاo واخرجت الارض اثقالها o وقال الانسان مالها o اِن آیات میں ایک بات کہی گئی مگر قافیہ کا حُسن دیکھئے کہ کس قدر سماعت کو لطف دے رہا ہے۔ ان آیات میں زلزال اور اثقال دو لفظ ہیں، زلزال بہ صورتِ مصدر لایا گیا جبکہ اثقال ثقل کی جمع کی صورت میں لایا گیا، مگر دونوں کا قافیہ ایک ہے یعنی زلزالھا واثقالھا، اب آگے دیکھئے وقال الانسان مالها۔ اس میں ما الگ لفظ ہے جو ما استفہامیہ بمعنیٰ استعظام یا استعجاب ہے اور لھا الگ ایک لفظ ہے جو لام حرفِ جار اور ھا ضمیر مجرور سے مل کر بنا ہے۔

اب جب آیات پڑھی جائیں گی تو زلزال، اثقال کے بعد مالها بھی اُسی انداز میں پڑھا جائے گا۔ اگرچہ زلزال ، اثقال کی طرح مالها نہ مصدر ہے اور نہ کسی لفظ کی جمع ہے۔ مگر اِس لفظ کو اس خوبصورتی سے یہاں نگینے کی طرح جڑ دیا گیا کہ فصحائے عرب انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے۔ ان تینوں الفاظ میں زلزا، اثقا، اور ما قافیہ قرار پاتا ہے اور لھا ردیف کی جگہ استعمال ہو رہی ہے یوں تو قرآنِ مجید میں اس قسم کی ہزار مثالیں موجود ہیں، مگر یہاں مختصراً بات سمجھانے کی حد تک ایک دوسری مثال پیش کی جاتی ہے :

ان آیاتِ مبارکہ میں وماسوّٰها تک تمام صیغے ماضی کے لائے گئے سوائے یغشیٰ کے کیوں کہ یہ مضارع معلوم کا صیغہ ہے اور اُن کے بعد ھا ضمیر مؤنث کے بار بار استعمال نے کیا لطف پیدا کر دیا اور پھر ذرا قوافی کا انداز بدل کر فالهمها فجورها نے بیان کے کیا معجزانہ تیور دکھائے اور پھر آخر و تقوٰی ھا کے لفظ نے سابقہ چھ جملوں میں استعمال شدہ ماضی اور مضارع کے صیغوں کا دوبارہ وزن قائم کر کے قاری اور سامع کا محظوظ ہونا برقرار رکھا۔ اگرچہ تقوٰی ھا میں لفظِ تقوٰی مصدری صورت میں واقع ہوا، مگر چوں کہ اس کا قافیہ بھی الف کا تھا اور ماضی کے سابقہ تمام صیغوں کا قافیہ بھی الف مقصورہ آ رہا تھا اس لیے ماضی مضارع اور مصدر صوتی

آہنگ میں مربوط ہونے کے سبب برابر کا لطف دے رہے ہیں۔ اگرچہ قرآنِ مجید میں ایسی صورتیں جہاں بھی آتی ہیں اُن کو سجع بندی یا قافیہ وردیف سے تعبیر نہیں کرتے تاکہ قرآنِ پاک کو شاعرانہ کلام یا محض شاعری نہ کہا جا سکے بلکہ اس طرح کی صورت قرآنِ پاک میں واقع ہوتو اس کو فاصلہ کہتے ہیں جس کی جمع فواصل آتی ہے۔ جیسا کہ مذکورہ سورۃ یا سورۃ الضحٰی وغیرہ میں ہے۔

والشمس وضحٰہاo والقمر اذا تلٰہاo والنہار اذا جلّٰہاo
والیل اذا یغشٰہاo والسّمآء و ما بنٰہاo والارض و ما طحٰہاo
ونفس وّما سوّٰہا o فالہمہا فجورہا و تقوٰہا....الخ

لیکن ہم نے فقط سمجھانے کے لیے مغلق اصطلاح کے بجائے عام فہم الفاظ قافیہ وردیف کے حوالے سے بیان کیے ہیں۔ ان دو مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ نظم ہو یا نثر قافیہ اور ردیف جہاں بھی پائے جائیں سامعتوں کو محظوظ کیے بغیر نہیں چھوڑتے۔

اس کے بعد ہم ایک مثال حضور ﷺ کی حدیث شریف سے دینا چاہتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد آپ ﷺ پوری کائنات میں افصح العرب والعجم اور استاذِ کل ہیں۔

ایک مرتبہ بارش کی دُعا میں فرمایا۔ اللھم حوالینا لا علینا ، بل علی اکام الجبال والاودیة اس مبارک جملے میں آپ نے دیکھا کہ فصاحت و بلاغت اور لسانی لوازم و محاسن کو کس نقطۂ کمال پر لا کر بیانِ مدعا کیا گیا۔ حوالینا اور لا علینا کے معجزانہ جملے پر تو فصحائے مشرکین بھی سر دُھنتے ہوں گے۔

بعض تنگ نظر ملاحدہ نے قرآنِ مجید کی آیات میں تضاد ثابت کرنا چاہا، مگر ہمارے ذہین و فطین اہلِ علم نے اُن کے ایسے دندان شکن جواب دیئے کہ پھر اُن کا قلم سنجیدگی سے اس موضوع پر نہ اُٹھ سکا۔ دوسرے اعتراضات کے علاوہ اُن کا یہ اعتراض بھی تھا کہ نعوذ باللہ آیات میں محض

عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی سے کام لیا گیا، حالانکہ وہی بات سادہ اور غیر مقفّٰی عبارات میں بھی کہی جا سکتی تھی، مگر اُن کے یہ سارے اعتراضات بے معنٰی اور لغو ہیں۔ اُنہیں کیا معلوم کہ بات کرنے کا ڈھنگ کیا ہوتا ہے۔ فصاحت کے کیا معنٰی ہیں اور بلاغت کسے کہتے ہیں۔ اگر اُن کو عربی زبان کا کچھ بھی علم ہوتا اور الفاظ سے محظوظ ہونے کی ذرّہ بھر صلاحیت رکھتے تو اس قسم کے بے ہودہ اور کھوکھلے اعتراضات نہ کرتے۔ مگر اسلام دشمنی کی دبیز پٹّیاں جب آنکھوں پر چڑھ چکی ہوں تو پھر قرآنِ مجید جیسا کلامِ موجز و معجز بھی محض قافیہ پیمائی اور عبارت آرائی ہی نظر آتا ہے۔ قرآنِ مجید نے اِسی لیے اُس دور کے فصحائے عرب کو جو غیر مسلم تھے۔ فأتوا بسورة من مّثلہٖ کے الفاظ سے میدانِ بیان میں اترنے کا چیلنج دیا تھا۔ مگر آج تک تنگ نظر حاسدین اور اسلام دُشمن عناصر قرآنی اسلوبِ بیان کے مقابلے میں محض باتیں ہی بنا سکے، کوئی آیت جواباً پیش نہ کر سکے۔ بات لفظِ خُدا سے چلی تھی مگر کہاں تک چلی گئی۔ چونکہ یہ مسئلہ بھی خالصتاً زبان و بیان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے قرآنِ مجید کے حوالے اور بعضِ آیات کریمہ کے ذکر کے ناتے زبان و بیان کا مقام اور اہمیت واضح کرنا پڑی۔ کیونکہ ہمارے نزدیک اللہ تعالیٰ کے کلام سے بڑھ کر دنیا میں کوئی کلام ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

لفظِ اللہ کی لُغوی و اصطلاحی تحقیق و توضیح اِس کی معنوی وسعت و جامعیت کو تسلیم کرنے کے باوجود بھی لفظِ اللہ کے قائم مقام لفظِ خُدا کا استعمال محض ضرورتِ شعری کی وجہ سے کیا جاتا ہے نہ کہ من کل الوجوہ اسے لفظِ اللہ کا متبادل سمجھا جاتا ہے۔ اور پھر چونکہ فارسی زبان والے لفظِ خُدا کو بمعنیٰ اللہ لکھتے بولتے آئے ہیں، اس لیے جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہو گا تو انسان کا ذہن مبذول کرانے کے لیے ایک لفظ ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ اس میں وہ مفہوم نہیں پایا جاتا، جو لفظِ اللہ میں ہے۔ یہ وہ بنیادی مجبوری اور اسباب ہیں جن کی بنا پر ہمارے اکابر صوفیائے علماء اور شعراء نے خُدا اور اللہ میں فرق سمجھتے ہوئے بھی اپنے اشعار میں لفظِ خُدا کو استعمال کیا اور یہ کوئی

ایسی بات نہیں کہ جس پر فتویٰ داغ دیا جائے۔ اسے زیادہ سے زیادہ ضرورتِ شعری کہہ لیں۔ اس کے باوجود میری کوشش رہتی ہے کہ خُدا کی جگہ لفظِ ''اللہ'' ہی استعمال کروں۔ جن اشعار میں خُدا کا لفظ استعمال کر دیا وہ تو ہو گیا لیکن جب سے یہ بات بطورِ مسئلہ سمجھ میں آئی تو اس کے بعد کوشش یہی رہتی ہے کہ نظم و نثر میں خُدا کی جگہ لفظِ ''اللہ'' ہی لکھوں۔

تسکین کا پیغام ہے اللہ اللہ
توحید کا اِک جام ہے اللہ اللہ
قُفلِ حاجات کی یہ کُنجی ہے نصیرؔ
اللہ بھی کیا نام ہے اللہ اللہ

☆☆☆☆☆☆